سر سیّد احمد خان کے تعلیمی وادبی نظریات اور جدید تقاضے

(Sir Syed Ahmad Khan's Educational & Literary Ideas and Modern Requirements)

DOI: https://doi.org/10.54692/nooretahqeeq.2022.06041831

ڈاکٹر شاہد اشرف

Dr. Shahid Ashraf
Assistant Professor, Department of Urdu
F.C, College University, Lahore.

Abstract:

Sir Syed Ahmed Khan gave valuable services in the field of politics, education and religion. It is a distinct thing that on all three levels, he had to face strong opposition. It is not easy to defy tradition and welcome the modern trends after the movement of Syed Ahmed Barelvi. Sir Syed realized that regain of lost prestige was possible only through practical politics, educational reforms and religious unity. So he guided the Muslims at the same time on all three levels. In this regard, his publications, establishment of scientific society and educating the masses are quite important. Later on, the foundation of Aligarh University was laid, which collectively helped to promote scientific thinking. The current era requires that the movement of educating people should be brought to light to eradicate sectarianism, linguistic prejudice and religious hatred. This article examines the current situation in the context of Sir Syed's scholarly and literary views. And such measures have been proposed, which can help to promote education and literature compatible with modern requirements of the ۲۱st century. In this regard, Sir Syed can be declared the greatest benefactor of the ۲۱th century.

Keywords:

Sir Syed Ahmad Khan, Educational Reforms, Modern Literary Trends, Syed Ahmad Barelvi, Sectarianism, Linguistic Prejudice, Religious Hatred, Aligarh University, Scientific Society.

علی گڑھ تحریک سے پہلے برصغیر میں سید احمد بریلوی، برہمو سماج، آریہ سماج اور دلی کالج کی تحاریک نے مختلف

طبقات پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ ان مختلف النوع تحاریک کا دائرہ کار محدود اور خاص نوعیت کا حامل تھا۔ ۱۸۵۷ء میں ادبی، سیاسی، تعلیمی اور مذہبی اعتبار سے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اس دور میں ماضی کی شان و شوکت کا زوال، موجودہ کی زبوں حالی اور مستقبل کی منصوبہ بندی کا احوال ملتا ہے۔ سرسید احمد خان اپنے عہد سے سو سال آگے دیکھنے کی سعی کر رہے تھے۔ ان کو خوب معلوم تھا کہ گذشتہ کے ساتھ آئندہ کا سفر ممکن نہیں ہے۔ علی گڑھ سائنٹیفک سوسائٹی کا قیام مسلمانانِ ہند کے آئندہ کی سمت سفر کا نقطۂ آغاز تھا۔ اس سوسائٹی کے قیام سے انگریزی زبان سے اردو زبان میں کتب کے تراجم کا آغاز ہوا۔ سرسید خوب جانتے تھے کہ مسلمان انگریزی تعلیم پڑھنا گناہ سمجھتے ہیں۔ اِس لیے کتابوں کے تراجم کے ذریعے سے انہیں جدید علوم وفنون سیکھنے کی طرف مائل کیا گیا ہے اور اس کے خاطر خواہ نتائج حاصل ہوئے۔

> "ذہنی آزادی کے بغیر کوئی سماج ترقی نہین کر سکتا۔ جس قوم نے فکر پر بندشیں لگائیں اس نے اپنی موت کے محضر نامے پر دستخط کر دیے۔ سائنٹیفک سوسائٹی نے ہراول دستے کا کام کیا۔ اور سرسید کی مہم کے لیے راستہ ہموار کیا۔"(۱)

سرسید نے گورنر جنرل کو ایک عرض داشت میں مطالبہ کیا تھا۔ اعلیٰ درجے کی تعلیم کے لیے ایک ایسا سررشتہ قائم کیا جائے کہ جہاں علوم و فنون کی تعلیم مقامی زبان میں ہونی چاہیے۔ مزید یہ کہ وہ امتحان جو کلکتہ یونیورسٹی انگریزی زبان میں لیتی ہے یہ سررشتہ مقامی زبان میں لے اور طلبہ کو یکساں معیار کی اسناد دی جائیں۔ یہ تجویز انگریزی زبان کے متاثر ہونے کی خدشہ کی بنا پر نامنظور کر دی گئی۔ مگر اس بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرسید کا ویژن کیا تھا۔ سرسید احمد خان پر یہ الزام درست نہیں کہ علی گڑھ کا قیام دراصل انگریزی زبان کی ترویج و ترقی کا ذریعہ تھا۔ ان کی دوررس نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ آگے چل کر مسلمانوں کو اُردو زبان بذریعہ تعلیم اختیار کرنے کے لیے مناسب اقدام ابھی سے کر لینے چاہییں۔ ورنیکلر یونیورسٹی کا قیام اسی سلسلے کی کڑی تھا مگر بعد میں ہندوؤں کی مخالفت اور اُردو زبان کے محدود امکان کے باعث انھوں نے اس منصوبے سے پہلو تہی اختیار کر لی۔

سرسید نے ۱۸٦۹ میں انگلستان کا دورہ کیا۔ یہ دورہ برصغیر کے مسلمانوں کے تعلیمی، سماجی، سیاسی اور مذہبی احیاء کا ذریعہ بن گیا۔ اُنھوں نے اس دورے میں انگریزی تہذیب، زبان، کلچر، مذہب اور سماج کا بغور جائزہ لیا اور واپس آکر انھوں نے مدرستہ العلوم اور تہذیب اخلاق کے منصوبے کا آغاز کیا۔ مدرستہ العلوم آگے چل کر علی گڑھ یونیورسٹی کی تکمیل کا ذریعہ ثابت ہوا۔

> "علی گڑھ تحریک نے زندگی کے جمال کو اجاگر کرنے کے بجائے مادی قدروں کو اہمیت دی۔ چنانچہ ادب کو بے غرض مسرت کا ذریعہ سمجھنے کے بجائے ایک ایسا وسیلہ قرار دیا جو مادی زندگی کو بدلنے اور اسے مائل بہ ارتقار کھنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔"(۲)

تہذیب الاخلاق نے مسلمانوں کی ذہنی تربیت اور سماجی شعور کو بیدار کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ یہ محض ایک رسالہ ہی نہیں تھا بلکہ برصغیر کے مسلمانوں کی زندگی کا آئینہ بھی قرار دیا جا سکتا تھا۔ علی گڑھ تحریک کے پس منظر میں تہذیب الاخلاق کی فکری جدوجہد شامل تھی۔

> ” حقیقت یہ ہے کہ سرسید نے اردو ادب کی اتنی عظیم الشان اور مختلف النوع خدمات انجام دی تھیں کہ اردو ادب کی پوری تاریخ میں کوئی دوسرا شخص ان کی ہم سری کا دعوی نہیں کر سکتا۔“(۳)

سرسید کے تعلیمی نظریات کو سامنے رکھا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ جدید تعلیم بذریعہ اردو زبان سامنے رکھ کر حکمت عملی مرتب کر رہے تھے۔ موجودہ دور میں اگر دیکھا جائے تو یہی دو چیلنج ہمیں بھی درپیش ہیں۔ یعنی جدید تعلیمی پروگرام اور اردو زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانا ترجیحات میں شامل نہیں ہے۔ اس وقت ملک میں پانچ مختلف تعلیمی نظام موجود ہیں۔ سنڈیکیٹ ادارے (جہاں اے اور اولیول پڑھائی جاتی ہے) انگریزی تعلیمی ادارے، فوجی سکول سسٹم، سرکاری سکول، دینی مدارس میں مختلف النوع سلیبس موجود ہے۔ ان حالات میں یکساں نظام تعلیم کا خواب پورا نہیں ہو سکتا ہے۔

کسی ملک کا جدید تعلیمی ڈھانچہ یکساں نظام تعلیم کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ جب تک ایک جیسے ذہن تیار نہیں ہوں گے اور ان کے مابین مکالمے کی سطح برابر نہیں ہو گی۔ صحت مندانہ ذہنی سرگرمیوں کا فروغ ممکن نہیں۔ ذریعۂ تعلیم کا مسئلہ اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔ لٹریسی ریٹ کی اہم وجوہات میں غربت کے ساتھ ساتھ زبان کا مسئلہ بھی ہے۔ جن لوگوں کے انگریزی ذریعۂ تعلیم کے ساتھ مفادات وابستہ ہیں۔ ہزار دلائل دیں گے، مگر جواباً اس دلیل کا کوئی جواب نہیں ہے کہ انگریزی ہی ترقی کا ذریعہ ہے تو چین، جرمنی، فرانس، روس جیسے ممالک نے کیسے ترقی کی منازل طے کی ہیں۔

سرسید جہاں دیدہ انسان تھے اور خوب جانتے تھے کہ مغرب کی سائنسی ترقی کو مقامی زبانوں میں منتقل کر کے لوگوں میں سماجی سائنسی شعور پیدا کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔

> ” علی گڑھ کی تحریک کا بنیادی مقصد مسلم طبقہ اشرافیہ کے بچوں کے لیے ایک ایسے تعلیمی ادارے کا قیام تھا جس میں جدید علوم و فنون کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اسلام کے صحیح اصول کی تعلیم بھی دی جائے۔“(۴)

موجودہ دور میں انٹرنیٹ کی سہولت نے دنیا بھر کی لائبریریوں کو کتاب کی صورت کھول کر رکھ دیا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ماہرین کی ایک جماعت تیار کی جائے جو یورپ اور امریکہ سمیت ترقی یافتہ ممالک کی لائبریریوں سے استفادہ کرتے ہوئے ان کتابوں کو اُردو ترجمے میں ڈھالنے کی سعی انجام دیں۔ اگر پاکستان کا مستقبل عزیز ہے تو

ہر صورت میں اردو زبان میں جدید علوم کی منتقلی کا فریضہ انجام دینا پڑے گا۔ قیمتی علمی خزانہ مختلف زبانوں میں موجود ہے اور ہر شخص کی دسترس میں ہے۔ حکومتی ترجیحات میں اُردو زبان کو سرکاری زبان کی صورت میں نافذ کرنا شامل نہیں ہے۔ اس لیے حکومتوں سے یہ توقع عبث ہے کہ وہ غیر ملکی زبانوں کے علمی سرمائے کو اُردو کے قالب میں ڈھالیں گے۔ آئین میں درج شقوں اور سپریم کورٹ کے فیصلوں سے انحراف کے بعد کوئی پاکستانی حکومت قابل اعتماد قرار نہیں دی جاسکتی ہے۔ یہ کام مخیر حضرات کے تعاون سے علمی حلقوں کو انجام دینا پڑے گا۔ اس کارِ خیر میں بھی اجتماعی سطح پر کاوش کی از حد ضرورت ہے۔ ممکن ہے کہ آئندہ کوئی اُردو زبان دوست حکومت بر سر اقتدار آجائے تو علمی زبان کی حیثیت سے اُردو زبان کا نصاب اداروں میں پڑھانے کی صورت نکل آئے۔ مجھے یقین ہے کہ کبھی نہ کبھی یہ ضرور ہو گا۔ بس ہمیں سر سید احمد کی طرح مقاصد سامنے رکھ کر کوشش جاری رکھنی چاہیے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سر سید اُردو کے پہلے مضمون نگار ہیں۔ سفر انگلستان کے دوران میں انھوں نے دو رسائل سپیکٹیٹر اور ٹیٹلر کے مطالعے سے "تہذیب اخلاق" کے اجراء کا منصوبہ بنایا۔ یہ رسائل انگریزوں کی ذہنی ،اخلاقی اور سماجی تربیت کا فریضہ سر انجام دے رہے تھے۔

سر سید نے انھی خطوط پر تہذیب الاخلاق کی بنیاد رکھی اور بہت جلد ایسے نثر نگاروں کی کھیپ تیار ہو گئی جن کے پیش نظر مقصدیت تھی۔ انھوں نے ادب کو مقصدیت کا جامہ پہنایا۔ سر سید کے مضامین میں کثیر تعداد طبع زاد اور کچھ تراجم پر مشتمل ہے۔ وہ اُردو طبقے کو انگریزی مضامین کے ذریعے ان کی فکری جہات سے متعارف کروانے کے خواہش مند تھے۔ اس ترجمے کے ذریعے ثقافت، تہذیب اور روایات کی بابت بھی آگاہی پیش نظر تھی۔ ادب اُن کے نزدیک زندگی کے وسیع تر مقاصد کے حصول کا موثر ذریعہ تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ علم ، حکمت اور شعور کا خزینہ بھی۔ انہوں نے غیر محسوس انداز میں اُردو داں طبقے کی ذہنی ترتیب کے ذریعے انھیں جدید فکر و فلسفہ ،قدیم تاریخ و روایات اور موجودہ مذہب و سائنس کی طرف مائل کیا۔ یوں موضوعاتی دائرے کو وسعت دی، سوچ کے نئے زاویے سامنے آئے اور زندگی کے دائرہ کار میں وسعت پیدا ہوئی۔ انہوں نے مسلمانوں کے علمی و ادبی سرمائے کی حفاظت کی۔ ہندی کے اثرات کو کم کیا اور اُردو زبان میں انگریزی الفاظ کے استعمال کو فروغ دینے کی کوشش کی گئی۔ اُردو نثر کا ذخیرہ فورٹ ولیم کالج کا مرہون منت تھا۔ اُن کے رفقائے کار میں نذیر احمد پہلے ناول نگار، شبلی نعمانی پہلے مؤرخ اور حالی سوانح نگار کی صورت میں سامنے آئے۔ اُردو نثر کے فروغ میں سر سید کی ادبی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ سر سید کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ادب میں عقل اور وجدان کو پروان چڑھایا اور سطحی جذبات، پراگندہ خیالات اور عمومی تاثرات سے نکال کر اُردو شاعری کو نئے رخ پر استوار کیا۔ اس کی ایک مثال "مدوجزر اسلام" قرار دی جاسکتی ہے۔ سر سید کی ایما پر اِس نظم کی تخلیق سے اُردو شاعری کے نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ نظم نہ صرف مسلمانوں کے عروج و زوال کا قصہ بیان کرتی ہے بلکہ انھیں غیر جذباتی سطح پر

زندگی کے تقاضے نبھانے کے لیے راہنمائی بھی کرتی ہے۔ سرسید خوب جانتے تھے۔

"انگریز کی یورش نے قدیم اور جدید کے درمیاں تصادم کی فضا پیدا کر دی تھی اور یوں ہندوستان کی تہذیبی زندگی، قومی ہئیت اور ملکی حالات کو پیچیدہ مسائل سے دوچار کر دیا تھا۔"(۵)

فنی سطح پر انہوں نے مصنف، تخلیق اور قاری کا رشتہ قائم کر کے قاری کی اہمیت کو اُجاگر کیا۔ یعنی قاری کا تحریر میں جذب ہونا مصنف کے طرز اسلوب کا مرہون منت ہوتا ہے۔ طرز ادا ایسی ہونی چاہیے کہ قاری کو سحر میں مبتلا کر دے ۔اُنھوں نیچرل شاعری کے رجحان کی حوصلہ افزائی کی اور آزاد نظم کے فروغ کی سعی کی۔ یوں آزاد نظم کے ابتدائی نقوش علی گڑھ سے وابستہ عبدالحلیم شرر کے ہاں دیکھنے میں آئے۔ اُردو انشائیہ بھی علی گڑھ کا مرہون منت ہے۔ سرسید کی مضمون نگاری اور مہدی بخاری کی اِنشاء نویسی کے بطن سے انشائیے کے خدوخال کی تشکیل ممکن ہوئی ہے۔ اِس اعتبار سے دیکھا جائے تو فکری، فنی اور صنفی اعتبار سے سرسید نے اُردو ادب کو نئی جہتوں سے متعارف کروایا ہے۔ حیرت انگیز طور پر وہ سیاسی، تعلیمی اور ادبی میدان میں غیر معمولی خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ جن لوگوں کو سرسید کی انگریز سے وفاداری کا گمان ہے وہ سرسید کا آزادی اور غلامی کے تناظر میں یہ اقتباس پڑھ لیں۔

"آزادی اور غلامی آپس میں ایسی نقیض ہیں کہ نہ دونوں کا اجتماع ہو سکتا ہے اور نہ دونوں کا ارتفاع اس لیے یہ دونوں داخل مرضی پروردگار نہیں ہو سکتیں ورنہ خود پروردگار کی مرضی میں تناقص لازم آوے گا جو اس کی حکمت بالغہ کے شایان نہیں ہے۔" (۶)

سرسید کے ادبی رفقاء میں نواب وقار الملک، مولوی چراغ علی، محسن الملک، الطاف حسین حالی، مولانا شبلی نعمانی، مولوی نذیر احمد، مولوی ذکاءاللہ اور عبدالحلیم شرر شامل ہیں۔ یہ ارباب قلم اردو ادب کے ماتھے کا جھومر ہیں۔ اپنے اپنے میدان کے شہ سوار ہیں۔ ان کے تذکرے کے بغیر ادبی تاریخ نامکمل سمجھی جاتی ہے۔ موجودہ دور میں سرسید کے ادبی تصورات کو مزید آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ مثلاً انشائیہ اور آزاد نظم نے اپنا وجود تسلیم کروالیا ہے۔ مگر اس کے باوجود اسے مضمون اور غزل کے مقابلے میں ثانوی حیثیت حاصل ہے۔ یہاں اصناف کے مابین تقابلی جائزہ مقصود نہیں ہے۔ نقطۂ نظر صرف یہ ہے کہ انشائیہ اور آزاد نظم کا قاری غزل اور مضمون کی نسبت کم ہے۔ کتب بھی کم تعداد میں شائع ہوتی ہیں۔ البتہ آزاد نظم کے بعد نثری نظم کو کافی مقبولیت حاصل ہوگئی ہے۔ عروض کی عدم پابندی کے سبب اسے نئے لکھنے والوں نے پسند کیا ہے مگر اس صنف کو بڑا شاعر میسر نہیں آیا ہے۔

فکری اعتبار سے سرسید کے اصطلاحی پروگرام کو آگے بڑھانا چاہئے۔ ادب محض لذت اور جمال کا مجموعہ نہیں ہے۔ اس کا تعلق زندگی کی اعلیٰ قدروں سے ہے سو، اس باب میں ترجیحات کا تعین ضروری ہے۔ ویسے بھی دنیا کا ہر ادب

خاص نظریے، فلسفے یا عقیدے کے تحت تخلیق ہوتا ہے۔ اُردو ادب کی اصلاحی تحریک کو تقویت پہنچانے کی ضرورت ہے۔

موجودہ زمانے میں مابعد جدیدیت، پس ساختیات اور پوسٹ کالونی ازم کا چرچا سنائی دیتا ہے۔ ان تنقیدی تصورات میں اصلاحی پہلو عنقا ہو گیا ہے۔ ادب بذریعہ اصلاح کے سبب لسانی تعصب، فرقہ واریت اور علاقائی انتشار سے بچاؤ ممکن ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ سماجی برائیوں اور اخلاقی زبوں حالی کا مقابلہ کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔ سر سید کے بعد ادب کی اصلاحی تحریک کو کوئی پلیٹ فارم میسر نہیں آیا ہے۔ البتہ انفرادی سطح پر مختلف ادباء کے ہاں اس کی گونج ضرور سنائی دیتی ہے۔ حالات کا تقاضا یا وقت کی ضرورت کو سمجھا جائے تو ادبی سطح پر ایک سر سید احمد خان کی شدید کمی محسوس ہوتی ہے۔ ادبی ہی نہیں تعلیمی، سیاسی اور سماجی سطح پر بھی ان کا کوئی متبادل موجود نہیں ہے۔ چوں کہ ہمارا دائرہِ کار ادب کو محیط ہے اس لیے ادبی میدان میں اصلاحی تحریک کے آغاز کی ضرورت پہلے سے شدید تر محسوس ہوتی ہے۔ ویسے تو پاکستان روز اول سے فکری بحران کا شکار رہا ہے مگر اب اس میں شدت نکتۂ عروج کو دکھائی دیتی ہے۔ اس شدت کو کم کرنے کے لیے ادب بہترین ذریعہ ثابت ہو سکتا ہے۔ مگر مسئلہ یہی ہے کہ ایسے ادباء کو کوئی منظم پلیٹ فارم میسر نہیں ہے اور ان کی آواز موجود شور و شر میں کم سنائی دیتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ خلیق احمد نظامی، پروفیسر، سر سید ایک تعارف، نئی دلی: ۲۵ رعنا پبلشرس، ۱۹۷۴، ص:۸

۲۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۱۸، ص:۲۹۵

۳۔ خلیق احمد نظامی، علی گڑھ کی علمی خدمات، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دلی: ۱۹۹۴، ص:۱۸

۴۔ مظہر حسین۔ علی گڑھ تحریک، سیاسی و سماجی مطالعہ، نئی دلی: انجمن ترقی اردو، ۲۰۰۲، ص:۲۲۵

۵۔ انور سدید، اردو ادب کی تحریکیں، ص: ۲۸۲

۶۔ سر سید، مقالات سر سید، مرتب: محمد اسماعیل پانی پتی، لاہور: مجلس ترقی ادب، حصہ چہارم، سن ندارد، ص:۳۶۱